فلسفیِ اقبال

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران*
ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر**

Abstract:

The article deals with very important aspects of Iqbal study. The people engaged with research & criticism in this area raised this question time and again either Iqbal was a philosopher or a poet compossing the various dimensions of philosophy in his poetry. The writer of this article of the opinion that Iqbal was one of those creative writer who have the ability to dilute the philosophy of their time or their own, into poetry..

ایک فلاسفر کے طور پر اقبال کی شناخت کے تین بڑے عنوان ہیں۔ اوّل یہ کہ بطور طالب علم اور ریسرچ اسکالر کے انھوں نے فلسفے کو اپنے شعبہ علم کے طور پر اختیار کیا اور اعلیٰ سطح پر اس علم کی تحصیل کی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے ''اسرارِ خودی'' میں اپنا ایک خاص منظّم و مرتب فلسفہ پیش کیا۔ یہ فلسفہ خودی اقبال کی بطور فلسفی شناخت کا باعث بنا اور تیسرے یہ کہ فلسفے کے طالب علم اور محقق ہونے کی حیثیت سے اقبال نے مغربی فلسفے کے بنیادی منابع سے آگاہی کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفے کو نہ صرف مغرب میں متعارف کرایا بلکہ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ مزاج اور مفاخر کو متصل کرنے کی کامیاب کوشش کی اور یہی بطور فلسفی اقبال کا بڑا امتیاز ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اقبال کی ہمہ جہت عظمت کو ہمہ نوع مخالفت کا بھی شروع سے سامنا رہا۔ مثال کے طور پر اقبال ایک عظیم تر شاعر ہیں، لیکن ان کی شاعری کو اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا۔ پھر یہ کہ وہ ایک بڑے مسلم فلسفی ہیں، تو ان کی فلسفیانہ عظمت کے اعتراف کو بھی بخل کا سامنا کرنا پڑا۔ کہا گیا کہ اقبال فلسفی نہیں ہیں وہ تو متکلم ہیں۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اقبال اپنے آپ کو نہ تو شاعر سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنے فلسفی ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ انھوں نے تو کہا کہ جس نے مجھے شاعر سمجھا، گویا اس نے میرے ساتھ ظلم کیا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ اقبال کی

* صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
** شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

رائے میں ان کی شاعرانہ عظمت کے سائے میں ان کے ادا کردہ معانی و مفہوم کو نظر انداز نہ کیا جائے، یا یہ کہ ان کے پیغام یا موقف کو محض شاعر کا خیال کہہ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کو ترسیلِ معانی کا محض ایک ذریعہ خیال کرتے تھے۔ اسی طرح اقبال کا اپنا ایک خاص فلسفیانہ نظام ہے، اساسی طور پر وہ ایک مسلمان فلسفی ہیں۔ اب اگر ان کا مسلمان ہونا ان کے فلسفی ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ بھی ایک فکری ابہام ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہر فلسفی کا کوئی نہ کوئی عقیدہ، کوئی نہ کوئی مذہب یا حیات و کائنات کے بارے میں کسی نہ کسی طرح کا کوئی تصور ضرور ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ فلسفے اور مذہب میں بنیادی بُعد یا فرق انکار خدا اور اثبات خدا کا ہے۔ فلسفہ کسی ایسی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا جو دلیل اور ثبوت پر مبنی نہ ہو۔ اب ملحد ہونا بجائے خود ایک راسخ عقیدے کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کی اپنی شرائط وضوابط ہیں۔ تو جب کسی فلسفی کا یہودی اور عیسائی بنیاد کا حامل ہونا اس کی فلسفیانہ معروضیت پر اثرانداز نہیں ہوتا، اسی طرح اقبال کا ایک پر یقین مسلمان ہونا ان کی فلسفیانہ اساس کو مجروح نہیں کرتا۔ اقبال وضاحت کرتے ہیں کہ:

> ''مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم وفنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر پرکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوگی۔''(۱)

امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال بطور فلسفی انسان، کائنات اور خدا کے رشتے کو سمجھنے کے لیے دلیل، منطق اور علم کے کسی ذریعے پر اپنی اقلیم فکر میں داخلے پر پابندی عائد نہیں کرتے۔ علم اگر وسیع تر انسانی زندگی اور اس کے احوال پر اثر انداز ہو رہا ہے تو پھر ایسے علم کی، اس کے منابع جو بھی ہوں فلسفیانہ جانچ ضروری ہے۔ تشکیل جدید (Reconstruction) کے پہلے چار خطبے انہی امور کی وضاحت کرتے ہیں۔ یعنی علم اور مذہبی مشاہدات اور مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا اور خودی، جبر وقدر، حیات بعد الموت۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال ایک مسلم فلسفی ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ سائنس اور مذہب کے باہم متصادم ہونے کے تصور پر یقین نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ان مغربی فلاسفہ کے ہاں نظر آتا ہے جو اساسی طور پر عیسائی یا یہودی تھے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ مذہب اور سائنس کے تصادم کا تصور درحقیقت عیسائیت اور سائنس کے درمیان تصادم کا قضیہ ہے۔ یورپ میں رومن کیتھولک چرچ سائنس دانوں اور فلسفیوں سے متصادم ہوا اور اس تصادم میں جیسا کہ ہونا بھی چاہیے تھا چرچ کو شکست اور سائنس کو فتح نصیب ہوئی۔ کچھ یہی پس منظر ہے کہ مغربی فلاسفہ مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کے ازلی دشمن قیاس کرنے لگے لیکن مسلمان دنیا میں ایسا نہیں ہوا۔ اقبال وضاحت کرتے ہیں کہ:

''سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے۔ قرآن کریم کے ہر صفحہ پر انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور منتہائے نظر یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔''(۲)

تو یہی ذہنی پس منظر ہے جو اقبال کو مسلمان رہتے ہوئے فلسفے کی سرزمین میں اجنبی نہیں بناتا۔ وہ اس مذہبی فکر کو، جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے، سائنسی انکشافات سے متصادم خیال نہیں کرتے۔ یہی چیز انھیں مذہبی مشاہدات کی منطقی اور علمی پرکھ کی طرف مائل کرتی ہے۔ اقبال نے اسرار و رموز میں اپنا مربوط و منظّم فلسفہ پیش کیا۔ اپنے خطبات میں انھوں نے مسلم ذہن کو متاثر یا متوجہ کرنے والے بنیادی ذہنی مسائل کو خالص علمی انداز اور خالص فلسفیانہ منہاج سے حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ ان کی اس کوشش کی اندرونی قوت اور نتیجہ خیز ثروت کا اندازہ خطبات کے دیباچے کی ان سطور سے لگایا جا سکتا ہے:

"... There is no such thing as finality in philosophical thinking. As knowledge advances and fresh avenues of thought are opened, other views, and probably sounder views than set forth in these lectures, are possible. Our duty is carefully to watch the progress of human thoughts, and to maintain an independent critical attitude towards' it."(۴)

فلسفیانہ تفکر میں کسی چیز، نکتہ نظر، موقف یا نتیجہ فکر کو حتمی خیال نہ کرنے کو بنیاد مان کر آگے بڑھنے والے ذہن کی معروضیت کو محض اس لیے چیلنج نہیں کیا جا سکتا کہ وہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہے۔ امر واقعہ یہ کہ بیسویں صدی کے اوائل میں پوری مسلم دنیا میں علامہ محمد اقبال ہی وہ واحد آواز ہیں جو حیات اور کائنات کے بارے میں اس توانائی اور وسعت نظر سے اپنے مطالعات اور تحقیقات کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں اور آج اکیسویں صدی کے اوائل تک اقبال جیسا شاعر اور اقبال کی طرح کا فلسفی پوری مسلم دنیا میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ تو یوں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر کے مسلمان کی ذہنی زندگی میں علامہ اقبال کی مرکزی حیثیت کیا اہمیت رکھتی ہے۔

اقبال ایک فلسفی تھے، شاعری ان کے لیے ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ تھا اور بس اپنے فلسفیانہ افکار و نظریات کے لیے انھوں نے شاعری پر اکتفا کرنے کی بجائے سنجیدہ علمی نثر کو ذریعہ اظہار بنایا۔ فلسفے اور مذہب میں

کیا فرق و امتیاز ہے، اقبال سے بہتر کون جانتا ہوگا؟ لیکن بطور فلسفی اقبال کا مطالبہ یا موقف صرف یہ رہا کہ مذہب کی بدولت جس علم کا دعویٰ کیا جاتا ہے اسے ہمہ وقت متغیر و متحرک سائنس کی زبان میں سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ یقینی طور پر علم، وہ جس ذریعہ سے بھی تخلیق پائے، یا اس کا ظہور جس منہاج سے بھی ہو، سنجیدہ غور و فکر کا عنوان ہونا چاہیے اور جیسے جیسے جہان عالم میں توسیع ہوتی رہتی ہے، سمجھ بوجھ اور حقائق کو پرکھنے کے نت نئے اسلوب ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ تازہ اور نادر دلائل و براہین بھی، تو ایسے میں اگر بیسویں صدی کا ایک فلسفی مذہب اور فلسفے کو باہم متصادم و متغائر قیاس کرنے کے عوض، ان میں ہم آہنگی تلاش کرنے کی مربوط و منظم کوشش کرتا ہے تو اس کے استدلال کو سنجیدہ غور و فکر کا عنوان بنانا چاہیے۔

اقبال اپنی بے مثال انکساری کی بدولت برملا اصرار کرتے ہیں:

''بے شک میرے اشعار میں مختلف مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں ہے۔''(۵)

اسے ایک بڑے آدمی کا انکسار ہی کہنا چاہیے، معلوم ہے کہ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے اپنا فلسفہ خودی پیش کیا۔ ان کے اپنے ملک یعنی ہندوستان میں تو اسرار خودی کے مطالب کو کوئی نہ سمجھا، الٹا عجمی تصوف کے حامی ناتراشیدہ صوفیوں نے اس کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور ایسے ایسے مباحث شروع ہوئے کہ اصل مطالب اور حقیقی معنوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے برعکس اے آر نکلسن اسرار خودی کے مطالعے سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ فوراً اقبال سے اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت حاصل کرتا ہے اور پھر اس ترجمے سے مغرب فلسفی اقبال سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ نکلسن کی رائے میں:

''اقبال کا فلسفہ باوصف مذہبی ہونے کے کلیۃً مذہب کا تابعدار نہیں ہے۔''(۶)

نکلسن اس مثنوی کے مطالعے سے اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ:

''ان کے افکار مسلم ذہن میں انقلابی تبدیلی کے مترادف ہیں۔''(۷)

یہاں پھر اقبال سے رجوع کرتے ہیں، جنھوں نے از راہ انکسار کہا تھا کہ میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں ہے۔ اسی تسلسل میں اقبال یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

''البتہ فلسفے کے ایک مسئلے یعنی حیات بعد الممات کے ساتھ مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرور ہے۔''(۸)

دراصل فلسفے کا یہی مسئلہ اقبال کے فلسفہ خودی کی اساس ہے۔ اقبال بنیادی طور پر انسان کے مستحکم حال، شاندار مستقبل اور کائنات میں اس کی مستقل حیثیت کے بارے میں شدت سے آرزومند اور حد درجہ پرامید نظر آتے

ہیں اور انسان کی ہستی کے بارے میں اقبال کا یہی یقین انھیں رجائی فلسفی کے طور پر شناخت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی فلسفیانہ رجائیت اقبال کو مذہبی تفکر کی تشکیل جدید reconstruction کرنے کی کوشش پر آمادہ کرتی ہے۔ مسلم دنیا میں یہ ایک بہت بڑی جسارت تھی۔ جنوبی ہندوستان کی مسلم کمیونٹی ہی میں یہ ذہنی وسعت اور علمی تحمل موجود تھا کہ وہ ایسے مباحث سن اور کسی حد تک سمجھ سکیں۔ ایک حد درجہ قدامت پسند معاشرے میں جو اپنے زوال کی تاریکی میں خود اپنے چہرے کے نقوش تک سے بے خبر ہوا جا رہا تھا، ایسی جسارت ایک بہت بڑا نیک شگون خیال کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے اپنے یہ خطبات مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں پیش کیے۔ اقبال نے یہ مباحث انگریزی زبان میں اس لیے بھی پیش کیے تھے کہ ان کے خیال میں اردو دان ذہن ان مباحث کو سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہوا بھی یہی، قدامت پرست علماء نے ان خطبات میں پیش کیے گئے بیشتر خیالات سے شدید اختلاف کیا۔ سید سلیمان ندوی سے منسوب یہ بیان کہ ''اگر اقبال یہ کتاب نہ لکھتے تو بہتر تھا۔''(۹) اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا یہ موقف کہ ''اقبال کے ہاں اسلام اور فکر اسلامی کی بعض ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن کے ساتھ اتفاق کر سکنا بڑا مشکل ہے۔''(۱۰) اس طرح مولانا نجم الدین اصلاحی کہتے ہیں کہ ''ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ اہمیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں۔''(۱۱) دراصل طبقہ علماء ایک تو تقلید کی روش اور قدامت پرستی کے باعث اور دوسرے اقبال کے سیاسی نظریات سے اپنے شدید اختلاف کی وجہ سے اقبال کی تشکیل جدید اور تعبیر نو سے متفق نہیں ہو پاتے۔ وہ قدامت پرست طبقہ علماء کے قائم کردہ حصارِ دین میں اقبال کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے۔ انھیں اقبال کی مغربی فلسفے کی تحصیل اور فلاسفہ وحکمائے مغرب کی توصیف اور اخذ و قبول کی روش سے بھی اختلاف ہے۔ دوسری طرف فلسفے کے ایسے طالب علم اور شارح بھی ہیں جو مذہب سے اقبال کی دلچسپی کے باعث اقبال کو فلسفی تسلیم کرنے میں متامل نظر آتے ہیں۔ یہ ساری صورت حال اشارہ کرتی ہے کہ اقبال نے جہانِ علم و دانش میں کوئی بہت بڑا، بنیادی اور اہم ترین کام ضرور کیا ہے، یا کرنے کا آغاز کیا ہے جس کی وجہ سے ان افکار و نظریات اور موضوعات اور ان پر بات کرنے کے وسیع اثرات سے تعلق رکھنے والے افراد، علماء اور فلاسفہ سبھی ایک غیر محسوس اضطراب محسوس کرتے نظر آتے ہیں۔ بطور ایک مسلمان فلسفی اقبال نے اپنا کام کر دکھایا۔ انھوں نے صدیوں کے جمود پر کاری ضرب لگائی۔ انھوں نے اپنی فکری توانائی مغرب سے کشمکش میں تلاش نہیں کی انھوں نے جدید علوم اور سائنس کی فتوحات وانکشافات کو اپنا معاون بنایا اور اپنا سفر جاری رکھا۔

اپنے اس انکسار کے باوصف کہ میرا کوئی منظّم و مرتب فلسفہ نہیں ہے، اقبال کے فلسفیانہ تفکر کا محور انسان کی بقا، کائنات میں اس کی دوامی حیثیت اور خدا کے شریک کار کے طور پر استحکام خودی ہے۔ یہ اس طرح کی فلسفیانہ تخصیص خیال کی جا سکتی ہے جس طرح کانٹ کے ہاں تنقید عقل کا عنوان، یا برگساں کا تصور زماں، جس میں اقبال کو دلچسپی تو ہے لیکن کلی طور پر اتفاق نہیں۔ انسان و کائنات اور خدا کے باہم ربط و تعلق کی نوعیت، معنویت اور اہمیت کو

اپنے غور وفکر کا عنوان بنانے اور اس ہمہ جہت تفکر کے نتائج کو منظّم ومرتب صورت میں پیش کرنے کے لیے اقبال کبھی شعر کا آہنگ استعمال کرتے ہیں اور کبھی دقیق فلسفیانہ خطبات کا۔ اقبال فلسفے کی جملہ لغوی ومعنوی تشریحات کے مطابق ایک زیرک فلسفی تھے۔ ایک ایسا فلسفی جو انسان، کائنات اور خدا کی تکوین کا سب سے بامعنی سرا 'انسان' کو خیال کرتا ہے۔ جو کائنات کو اپنی زرم گاہ اور خود کو خدا کے ارادوں کا راز دار اور شریک کار خیال کرتا ہے۔ اقبال کا فلسفہ کرہ ارض پر بسنے والے حضرت آدم اور اس کی اولاد کو ایک حیات اجتماعیہ انسانیہ میں بدل کر آزادی، مساوات اور یک جہتی کے ارفع رشتے میں پرونا چاہتا ہے۔ خوشی، خوش حالی اور کائنات میں مرکزیت کو انسان کا نصیب خیال کرنے والا اقبال ایک ایسا انسان دوست فلسفی ہے جو ترسیل معانی کے لیے شاعری کی ارفع ترین صلاحیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، گفتار اقبال، مرتبہ محمد رفیق افضل (لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، طبع سوم، ستمبر ۱۹۸۹ء، ص۲، ۳

۲۔ اقبال، گفتار اقبال، مرتبہ محمد رفیق افضل، ص۲۳

۳۔ مثنوی اسرار خودی، ۱۹۱۵ء، مثنوی رموز بے خودی، ۱۹۱۸ء

۴۔ Iqbal, The reconstrcution of religious thought in Islam, (Lahore: Iqbal academy pakistan, institute of Islamic Culture, 2nd, edition, 1989,) P.xxii

۵۔ اقبال، انڈیا سوسائٹی لندن سے خطاب ۴رنومبر ۱۹۳۱ء، مشمولہ سفر نامہ اقبال، مرتبہ محمد حمزہ فاروقی، (کراچی: مکتبہ اسلوب، طبع ثانی، ۱۹۸۹ء) ص۳۷

۶۔ اسرار خودی از اے آر نکلسن، اردو مترجم عبدالرحیم قدوانی، مشمولہ اقبال: جدید تنقیدی تناظرات، مرتبہ اسلوب احمد انصاری، (علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس، اشاعت فروری ۲۰۰۵ء) ص۱۲۴

۷۔ اسرار خودی از اے آر نکلسن، اردو مترجم عبدالرحیم قدوانی، ص۱۳۱

۸۔ اقبال، انڈیا سوسائٹی لندن سے خطاب ۴رنومبر ۱۹۳۱ء، مشمولہ سفر نامہ اقبال، مرتبہ محمد حمزہ فاروقی، (کراچی: مکتبہ اسلوب، طبع ثانی، ۱۹۸۹ء) ص۳۷

۹۔ خطبات اقبال، جاوید اقبال، ڈاکٹر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء) ص۶، ۷

۱۰۔ ایضاً، ص۷

۱۱۔ ایضاً، ص۸